سرکاری ملازمین کی "گروپ انشورنس"

"شامی و مصری علماء کی آراء کی روشنی میں"

پروفیسر محمد اسلم
صدر شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور

بیمہ دراصل ایک معاہدہ ہے جو مستقبل کے امکانی حادثات و ناگہانی خطرات میں مالی کفالت کے بیمہ دار (پالیسی ہولڈر) اور بیمہ کمپنی کے درمیان پہلے سے طے کردہ شرائط کے مطابق طے پاتا ہے۔ اس معاہدہ کے تحت بیمہ دار معینہ رقم قسط وار بیمہ کمپنی کو ادا کرتا ہے جس کو پریمیم (PREMIUM) کہتے ہیں اور بیمہ کمپنی اس کے عوض حادثہ یا موت کی صورت میں ایک مجموعی رقم واپس کرتی ہے جس کو بیمہ شدہ رقم (INSURED AMOUNT) کہتے ہیں۔

پاکستان میں جب حکومت نے بنک قومیائے تو بیمہ کمپنیاں بھی قومیالیں۔ اب بیمہ دار کا معاملہ بیمہ کمپنی سے نہیں بلکہ حکومت سے ہوتا ہے جس کا جواز مصر کے نامور عالم دین اور جامعہ ازہر کے شیخ مفتی محمد عبدہٗ اور ابو زہرہ کے ہاں ملتا ہے۔ ان کی رائے میں حکومت ہر شخص کے جان، مال اور آبرو کی محافظ اور ہر شخص کی کفالت کی ذمہ دار ہے لہذا اس کی حیثیت بعض حضرات کے ہاں ایک سربراہِ خاندان کی سی ہے۔ خاندان کے افراد اپنی آمدنی میں سے کچھ رقم سربراہِ خاندان کو دیتے ہیں، جو وہ رقم ضرورت کے وقت اپنے اہل خانہ پر خرچ کرتا ہے۔ (البتہ اگر وہ کمپنی پرائیویٹ ہو، تو تب یہ معاملہ بدستور مشتبہ رہتا ہے)۔

بیمہ ہمیشہ سے فقہاء کے مابین بحث کا موضوع بنا چلا آتا ہے۔ بعض اہل علم اس کے جواز کے قائل ہیں اور بعض حرمت کے۔ مولانا مفتی محمد شفیعؒ دیوبندی، جو فقیہہ فی النفس تھے، اپنی مشہور تفسیر "مَعَارِفُ القرآن" کی پانچویں جلد کے صفحہ ۳۷۵ پر مامورات و منہیات کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ اجتہادی اختلافات میں کسی جانب کو منکر نہیں کہا جا سکتا۔ لہٰذا اس اصول کے تحت راقم الحروف کی رائے میں بیمہ کے جواز اور حرمت کے اقوال میں سے جو قول بھی اختیار کر لیا جائے وہی صحیح ہوگا۔

دورِ حاضر کی ایک تحقیق کی رُو سے بیمہ کے موجد مسلمان ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اسپین (ہسپانیہ) میں اسلامی دورِ حکومت (۱۴۹۲ء - ۷۱۱ء) مسلمان تجار جہازوں کے ذریعے بھیجے جانے والے سامانِ تجارت کا بیمہ کراتے تھے، جسے وہ "سوکرہ" کہتے تھے۔

ردالمحتار کے فاضل مصنف علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ (۱۸۳۶ء - ۱۷۸۴ء) اپنی اس فاضلانہ تصنیف کے باب "کتاب الجہاد باب المستامن من فضل فی استئمان الکافر" میں لکھتے ہیں کہ تاجروں کی یہ عادت کہ جب وہ مال تجارت کے لیے کسی حربی کافر سے مال بردار جہاز کرایہ پر لیتے ہیں تو کرایہ کے علاوہ مزید کچھ رقم ادا کرتے ہیں۔ یہ حربی کافر دارالحرب کا باشندہ ہوتا ہے جو امن حاصل کر کے دارالاسلام کے سرحدی مقامات پر ٹھہرتا ہے۔ یہ شخص گویا سامانِ تجارت کا وکیل اور اسے منزلِ مقصود پر پہنچانے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اگر تجارتی سامان کو راستے میں جہاز کے ڈوبنے یا جلنے سے نقصان پہنچے تو وہ اس زائد رقم کے عوض نقصان کی پوری تلافی کرتا ہے۔ اس رقم کو "سوکرہ" کہتے ہیں اور اس پر معاملہ کرنے والے کو "صاحبِ سوکرہ"۔

ہماری رائے میں "سوکرہ" فرانسیسی زبان کے لفظ SECURITE یا انگریزی زبان کے لفظ SECURITY سے معرّب کیا گیا ہے جس کے معنی "امان و اطمینان" کے ہیں۔

ابن عابدین شامی کے زمانے میں صرف بحری جہازوں کے ذریعے حربی کافروں کے توسط سے دارالحرب میں بھیجے جانے والے سامان تجارت کا بیمہ کیا جاتا تھا اور بیمے کی موجودہ صورتیں ان دنوں مروّج نہ تھیں لہٰذا انہوں نے اسے دارالحرب میں جائز اور دارالاسلام میں ناجائز فرمایا ہے۔ اگر موصوف ہمارے عہد میں ہوتے تو شاید دارالاسلام میں بھی اس کے جواز کے قائل ہو جاتے۔

اپریل ۱۹۶۱ء میں جامعہ دمشق میں "تامین"، یعنی بیمہ کے موضوع پر ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں عالم اسلام کے ممتاز عالموں اور دانشوروں نے شرکت فرمائی۔ اس کانفرنس میں جن علماء نے اپنے تحقیقی مقالے پیش کیے اُن میں استاذ مصطفیٰ زرقا اور شیخ ابوزہرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں حضرات فقہ اور شریعت کے متخصص ہیں۔ ان میں سے مصطفیٰ زرقا بیمہ کے جواز کے قائل ہیں۔ انہوں نے اپنے مقالے کی بنیاد دو اُصولوں پر رکھی ہے۔

اولاً : شریعت میں عقود و معاملات کی جو تفصیل مذکور ہے کیا وہ ہر دور کے لحاظ سے کامل ہے یا بدلے ہوئے رجحانات اور حالات کے پیشِ نظر اس میں رد و بدل کی گنجائش ہے؟

ثانیاً : نئے عقود و معاملات میں اصل حرمت ہے، جب تک اباحت کی دلیل نہ ہو یا اصل اباحت ہے جب تک حرمت کی دلیل نہ پائی جائے؟

مصطفیٰ الزرقا کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ فقہاء کا اس بات پر اجماع ہے کہ حالات اور زمانے کی رعایت سے فقہی مسائل تبدیل ہو جاتے ہیں۔

مصطفیٰ زرقا کی یہ دلیل بڑی وزنی ہے کہ ہر دور کے معاشرے اور ملک کے مسائل الگ الگ ہو جاتے ہیں اس لیے ضرورت کے تحت فقہ بھی تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

راقم الحروف کے فاضل دوست مولانا محمد تقی امینی، سابق ناظم دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے فقہی مسائل میں حالات اور زمانے کی رعایت سے ایک فاضلانہ کتاب تصنیف کی ہے۔

مصطفیٰ زرقا لکھتے ہیں کہ کوئی سمجھ دار شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ بدلے ہوئے حالات و رجحانات کے پیشِ نظر عقود و معاملات کی نئی تنظیمیں ضروری ہیں البتہ ان تنظیموں کو شرعی حیثیت دینے کے لیے شرعی حدود و قیود کی رعایت ناگزیر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: كُلُّ شَرْطٍ لَيْسَ فِي كِتَابِ اللّٰهِ فَهُوَ بَاطِلٌ۔ یعنی ہر ایسی شرط جو اللہ کی کتاب میں نہ ہو، باطل ہے۔

مصطفیٰ زرقا فرماتے ہیں کہ اس حدیث مبارکہ میں کتاب اللہ سے قرآن مجید مراد نہیں بلکہ شریعت کے عمومی قواعد ہیں۔ مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًا ۔ (النسا : ۱۰۳)
(بے شک نماز مسلمانوں پر مقررہ وقت میں فرض ہے ۔ یہاں کتاب سے مکتوب مراد ہے) اس کی مزید تشریح اس حدیث مبارکہ سے ہوتی ہے ۔

ماکتبہُ اللہ عَلَی المؤمنین واوجبہٗ علیہم
(جس کو اللہ نے مومنوں کے لیے لکھ دیا اور ان پر لازم کر دیا)

اس سے مصطفیٰ زرقا یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جدید تنظیموں کے لیے جو قواعد وضوابط بنائے جائیں، وہ روح اسلامی کے منافی نہ ہوں ۔

اپنے مقالے کی دوسری بنیاد پر گفتگو کرتے ہوئے موصوف فرماتے ہیں کہ جمہور فقہاء کے نزدیک اصل اباحت ہے جب تک حرمت کی دلیل نہ پائی جائے ۔ مصطفیٰ زرقا لکھتے ہیں کہ اس کا ثبوت بیع الوفا کے سلسلے میں مل چکا ہے اور فقہاء نے کافی اختلاف ہونے کے باوجود اس کے جواز کو برقرار رکھا ہے ۔

اس موقع پر بیع الوفا کا ذکر بیجا نہ ہوگا ۔ قرونِ وسطیٰ میں یہ طریق وسط ایشیا میں رائج تھا اور بخاری کے تجار اس پر عمل کرتے تھے ۔ اس کی چند صورتیں ہیں :

۱ ۔ جس کو نقد روپیہ کی ضرورت ہوتی وہ کسی سے کچھ رقم لے کر اپنی زمین اس شرط پر اس کے حوالے کر دیتا کہ جب وہ رقم لوٹا دے گا تو زمین اُسے لوٹا دی جائے گی ۔

۲ ۔ بیچنے والا خریدار سے کہتا ہے کہ وہ ایک چیز اس شرط پر فروخت کر رہا ہے کہ وہ جب چاہے ، خریدار رقم لے کر وہ چیز اُسے لوٹا دے ۔

۳ ۔ بیچنے والا خریدار سے کہتا ہے کہ وہ ایک چیز اس قرض کے بدلے بیچتا ہے جو اس کے ذمے واجب الادا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ جب وہ قرض ادا کر دے تو یہ چیز پھر اس کی ملک ہو جائے گی ۔

علامہ ابن عابدین شامی رد المحتار کے باب ، کتاب الصرف میں لکھتے ہیں کہ اس طرح کی بیوع میں چونکہ خریدار کی طرف سے وعدہ پورا کرنے کا عہد پایا جاتا ہے وہ قیمت لوٹانے

پر خریدا ہوا مال بیچنے والے کو لوٹا دے گا، اسی بنا پر اسے بیع الوفا کہتے ہیں۔

مذکورہ صورت میں واپسی کے وقت خریدار کو پوری قیمت مل جاتی ہے اور واپسی سے قبل وہ کسی حق اور عوض کے بغیر اس چیز سے پوری طرح فائدہ اُٹھاتا ہے، جس سے ناجائز انتفاع کی صورت نکلتی ہے، بعض فقہاء نے اسے سُود کے زمرے میں شامل کیا ہے۔ اسلیے بیع الوفا فقہاء کے مابین مابہ النزاع رہی ہے لیکن اس کے باوجود فقہاء کی اکثریت نے اسے جائز سمجھا ہے۔ بیع الوفا قرون وسطیٰ میں وسط ایشیا میں عام تھی اور یہ وہ علاقہ ہے جہاں صدہا کی تعداد میں نامور فقہاء پیدا ہوئے ہیں، جن کا نام سنتے ہی ہماری گردنیں ادب و احترام کے ساتھ جھک جاتی ہیں۔

گویا مصطفیٰ الزرقا نے بیمہ کو بیع الوفا اور چند قدیم عقود کے مشابہ قرار دے کر اس کے جواز کا حکم تلاش کیا ہے۔ وہ قدیم عقود یہ ہیں:

اولاً: عقد موالاۃ یہ ایک طرح کا معاہدہ ہوا کرتا تھا جس میں ایک شخص دوسرے شخص کی ذمہ داری قبول کرتا اور دوسرا شخص اپنے بعد اپنے ترکے میں سے اُسے اپنا قائم مقام بناتا تھا۔ اسی طرح موجودہ زمانے میں پالیسی ہولڈر ایک معاہدے کے ذریعے بیمہ کمپنی کو ایک مقررہ رقم ادا کرتا ہے اور کمپنی اس کی وفات کے بعد اس کی قائم مقام بن کر اس کے اہل و عیال کے مصارف اور بچوں کی تعلیم و شادی کی ذمہ داری قبول کرتی ہے۔ یہ مسئولیاتی بیمہ یا (LIBILITY INSURANCE) کی شکل ہے۔

ثانیاً: نظام عاقلہ۔ قرنِ اوّل میں حادثات و خطرات کے وقت نقصان کی تلافی کے لیے باہمی امداد و اجتماعی جرمانے کا ایک نظام تھا جس میں عزیز و اقارب ہم پیشہ باہم مذہب لوگ شریک ہوتے تھے۔ (پاکستان میں اسمٰعیلی، بوہرے اور میمن تجار جب یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی جماعت کے کسی فرد کا تجارت میں ناقابل تلافی نقصان ہو گیا ہے تو وہ اس کی امداد کر کے اسے دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیتے ہیں۔ یہ نظام عاقلہ کی بہترین مثال ہے)

حدیث میں آتا ہے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اشعری صحابہ تنگ دست ہو جاتے تو وہ چادر بچھا کر اپنا اپنا اثاثہ اس پر رکھ دیتے اور پھر برابر برابر تقسیم کر لیتے۔

اس ضمن میں دوسری مثال حضرت عمر فاروقؓ کی ہے وہ یہ کہ وفات کے وقت حضرت عمر فاروقؓ ۸۶۰۰۰ درہم کے مقروض تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے عبداللہ کو وصیت کی کہ وہ ان کا مکان اور دوسرا اثاثہ فروخت کرکے یہ قرض ادا کر دیں۔ اس صورت میں بھی اگر قرض ادا نہ ہو تو وہ اپنے قبیلے بنو عدی سے اپیل کریں کہ وہ مل کر بقیہ رقم فراہم کر دیں اور اگر وہ ایسا نہ کر سکیں، تو پھر قریش سے کہیں کہ وہ مطلوبہ رقم اکٹھی کر دیں۔ (شبلی نعمانی، الفاروق، مطبوعہ کراچی ۱۹۷۰ء، ص ۲۶۷۔)

فقہ کی کتابوں مثلاً رد المحتار، فتاویٰ عالمگیری، المبسوط اور ہدایہ میں نظام عاقلہ محض "دیت" ادا کرنے کے لیے خاص نہیں بلکہ حادثات اور خطرات کے لیے بھی عام ہے۔ مصطفیٰ زرقا کی یہ رائے ہے کہ جس طرح نظام عاقلہ میں نقصان کی تلافی کے لیے قبیلے کو ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے اسی طرح حادثات کی صورت میں بیمہ کمپنی ذمہ دار بن جاتی ہے۔

ثالثاً: ضمان خطر الطریق (راستے کے خطرہ سے ضمانت)

علمائے احناف کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص کسی دوسرے شخص سے یہ کہے کہ وہ اس راستے سے سفر کرے کیونکہ وہ راستہ محفوظ ہے اور اس کی مزید تسلی کے لیے یہ کہے کہ اگر اُسے اس راہ میں کوئی نقصان اٹھانا پڑا تو وہ اس کا ذمہ دار ہوگا، ایسی صورت میں اگر مسافر کا واقعی نقصان ہو گیا تو مشورہ دینے والا نقصان پورا کرنے کا ذمہ دار ہوگا، اس صورت میں اسی طرح ایک شخص دوسرے شخص کے نقصان کی ذمہ داری قبول کرتا ہے، اسی طرح بیمہ کمپنی اموال کے نقصان کی ذمہ داری لیتی ہے۔

رابعاً: قاعدۃ الالتزامات۔ اس کی یہ صورت ہے کہ اگر کسی شخص نے دوسرے شخص سے قرض، عاریت یا خسارہ برداشت کرنے کا وعدہ کیا یا کسی ایسے کام کا وعدہ کیا جو اس کے ذمے لازم نہ تھا، تو مالکی فقہاء کے نزدیک یہ وعدہ پورا کرنا لازم ہوگا۔

مصطفیٰ زرقا کے نزدیک حفاظتی بیمہ اس کے مشابہ ہے۔ جس طرح ان صورتوں میں وعدہ پورا کرنا ضروری ہے اسی طرح حفاظتی بیمے میں حسب وعدہ نقصان کی تلافی ضروری ہے۔

خامساً: نظام التقاعد والمعاش،

اس نظام کے تحت سرکاری ملازمین کو ریٹائرمنٹ کے بعد پنشن ملتی ہے اور پنشن دینے اور لینے کے جواز میں کسی کو کوئی شبہ نہیں ہے۔ مصطفیٰ زرقا کے نزدیک زندگی کا بیمہ اس نظام کے مشابہ ہے۔ اس نظام کے تحت تنخواہ میں سے معمولی رقم جمع ہوتی رہتی ہے اور ریٹائرمنٹ کے بعد ملازمین یا ان کے لواحقین کو یہ جمع شدہ رقم پنشن یا گریجویٹی کی شکل میں یکمشت یا ماہ بماہ ملتی رہتی ہے۔

بیمے کی بھی یہی صورت ہے کہ قسط وار معمولی سی رقم جمع ہوتی رہتی ہے اور بیمے کی مدت پوری ہونے کے بعد بیمہ دار کو یا حادثاتی یا ناگہانی موت کی صورت میں اس کے نامزد لواحقین کو زرِ بیمہ کی شکل میں مل جاتی ہے۔

ان تمام صورتوں میں مصطفیٰ زرقا نے بیمے کا جواز تلاش کیا ہے۔ یہ بات خالی از دلچسپی نہیں کہ انہوں نے عقد موالاۃ، نظام عاقلہ، قاعدۃ الالتزامات، نظام التقاعد والمعاش اور ضمان الطریق کا تو ذکر کیا ہے لیکن موصوف قسامہ، حلف، ولا اور عقد جیسی تنظیمات کو نظر انداز کر گئے جن کا ذکر زمانۂ جاہلیت میں ملتا ہے اور حضور شارع علیہ السّلام نے انہیں برقرار رکھا ہے۔ اسی سے "عرف" کی قانونی حیثیت ثابت ہوتی ہے۔

۱۔ قسامہ: شمس الائمہ ابوبکر محمد بن ابی سہل احمد سرخسیؒ (م ۴۸۳ھ) صاحب المبسوط فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قسامہ کو اسی طرح برقرار رکھا جس طرح دورِ جاہلیت میں اس کا رواج تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ اگر مقتول کے قاتل کا پتہ نہ چلتا تو جس گاؤں یا محلے میں لاش پائی جاتی وہاں کے پچاس آدمیوں سے حلف لیا جاتا کہ انہیں قاتل کا علم نہیں ہے۔ اگر قاتل کا پتہ چل جاتا تو خیر، ورنہ اس گاؤں یا محلے کے باشندوں پر اجتماعی جرمانہ کر کے مقتول کے وارثوں کو دیت ادا کی جاتی تھی۔

شمس الائمہ سرخسی فرماتے ہیں کہ ایک بار انصارِ مدینہ نے یہود پر ایک مقتول کی دیت کے بارے میں دعویٰ کیا تو حضور شارع علیہ السّلام نے قسامہ کے مطابق ہی فیصلہ صادر فرمایا تھا۔ (المبسوط، ج ۲۶، ص ۱۰۸)

۲۔ حلف: حلف کی شکل عقدِ موالاۃ سے ملتی جلتی ہے۔ اس میں چند افراد چندہ جمع

کرکے باہمی مدد کیا کرتے تھے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب اشعری صحابہ تنگ ہو جاتے تو وہ اپنا مال ایک جگہ جمع کرکے برابر برابر تقسیم کر لیا کرتے تھے۔ حلف ایک طرح سے باہمی تعاون کی شکل ہے۔

۳۔ **ولاء** : اس کی شکل یہ تھی کہ غلام جس قبیلے سے آزاد کیا جاتا تھا وہ قبیلہ حادثات وخطرات میں اس کی مدد کرنے کا پابند تھا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسی قوم کا آزاد شدہ غلام اسی قوم کا فرد سمجھا جائے گا۔ (ہدایہ، ج ۴، کتاب العاقل)

۴۔ **عقد** : اس کے معنی کسی گروہ میں شامل ہونا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں کئی گروہ یا گروپ تھے جن میں شامل ہونے کے بعد حادثات وخطرات میں مدد کی ذمہ داری لی جاتی تھی۔ راقم الحروف کی نگاہ میں گروپ انشورنس اسی زمرے میں آتی ہے۔

مصطفیٰ زرقا اور راقم الحروف نے جن متعدد تنظیموں کا ذکر کیا ہے وہ سب خطرات و حادثات میں ضمانت حاصل کرنے کی مختلف شکلیں تھیں، موجودہ زمانے میں گروپ لائف انشورنس اسی زمرے میں آتی ہے۔

بعض اہل علم نے مصطفیٰ زرقا کے نظریات کی تردید کرتے ہوئے چھ اعتراضات اٹھائے ہیں:

۱۔ بیمہ ایک طرح سے جوا ہے۔

۲۔ بیمہ کا تعلق رہن کی اس قسم سے ہے، جو شرعاً ناجائز ہے۔

۳۔ بیمہ میں تقدیر الٰہی سے مقابلہ ہے۔

۴۔ بیمہ میں دھوکہ پایا جاتا ہے۔

۵۔ بیمہ میں جہالت پائی جاتی ہے کیونکہ یہ غائب کی بیع ہے۔

۶۔ بیمہ میں سود پایا جاتا ہے۔

فاضل مقالہ نگار نے ان اعتراضات کا جواب یوں دیا ہے:

۱۔ بیمہ جوا نہیں ہے کیونکہ جوا لہو ولعب کی ایک شکل ہے جو بہت سی اخلاقی اور اجتماعی برائیوں کو جنم دیتا ہے جب کہ بیمہ مستقبل کے حادثات وخطرات میں نقصان کی تلافی کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔

۲ ۔ رہن کی کسی بھی قسم سے بیمے کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ بیمے کے جو فوائد ہیں، وہ رہن کی صورت میں نہیں پائے جاتے ۔

۳ ۔ بیمہ تقدیر الٰہی سے مقابلہ اس بنا پر نہیں ہے کہ بیمہ میں حادثات وخطرات یا آسمانی آفات سے حفاظت کی ضمانت فراہم نہیں کی جاتی بلکہ نقصان کی ضمانت مہیا کی جاتی ہے ۔

۴ ۔ بیمہ دھوکہ اس لیے نہیں ہے کہ دھوکے میں ایک فریق کو سراسر فائدہ اور دوسرے کو سراسر نقصان ہوتا ہے ۔ بیمے کی عمومی حیثیت میں یہ صورت نہیں پائی جاتی کہ ایک فریق سراسر نقصان میں رہے اور دوسرا سراسر فائدے میں ۔ علمائے احناف کہتے ہیں کہ کفالت اور ضمانت کی بعض قدیم شکلوں میں بھی دھوکے کا شائبہ پایا جاتا ہے جن کی تفصیل ابن عابدین شامیؒ (م ۱۸۳۶ء) نے اپنی مشہور تصنیف رد المحتار کی کتاب الکفالۃ میں دی ہے، لیکن اسے معمولی قسم کا دھوکہ سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیا گیا ہے ۔

۵ ۔ ہر قسم کی جہالت معاملے کو فاسد نہیں کرتی بلکہ وہ جہالت معاملے کو فاسد کرتی ہے جو معاملے کے نافذ ہونے میں رکاوٹ پیدا کرے ۔

بیمے میں ایسی جہالت نہیں پائی جاتی جس سے یہ معاملہ نافذ نہ ہو سکے ۔

۶ ۔ سود بلاشبہ حرام ہے اور اس کے حرام ہونے پر نص قرآنی موجود ہے ۔ لیکن اس کی حرمت سے نفس بیمہ کے جواز میں فرق نہیں پڑتا، جیسے سود کی حرمت سے بیع، اجارہ وغیرہ دیگر عقود کے نفس جواز میں فرق نہیں پڑتا ۔

مصطفیٰ زرقا اپنی بحث کا اختتام ان الفاظ پر کرتے ہیں کہ وہ بیمہ کو فی نفسہ جائز سمجھتے ہیں لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ تمام وہ شکلیں جائز ہیں جن پر کمپنیاں عمل کرنے کے لیے مجبور ہیں یا جو اقسام بعض ممالک میں رائج ہیں ۔ بیمہ کا نظام فی نفسہ شرعاً صحیح ہے تو اس کی صحت کے لیے شرطوں اور شکلوں کا حکم بھی علیحدہ قرار پائے گا ۔ (عقد التامین ص ۵۲)

شیخ ابو زہرہ نے اپنے مقالے کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ وہ بیمہ کمپنی کے ساتھ معاملے کو جائز قرار نہیں دیتے لیکن حکومت کے ساتھ ایسا معاملہ جائز قرار دیتے ہیں کیونکہ وہ اسے اجتماعی تعاون پر محمول کرتے ہیں (عقد التامین : ص ۵۶)

راقم الحروف یہاں یہ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہے کہ اگر بیمہ کمپنیاں قومیائی جائیں، جیسا ہمارے ہاں ہوا ہے، تو پھر بیمہ کمپنی کے ساتھ معاملہ دراصل حکومت کے ساتھ ہی معاملہ ہوگا۔ یوں ابوزہرہ کی شرط پوری ہو جائے گی۔

ثانیاً عرض ہے کہ حکومت اگر ملازمین کی گروپ انشورنس کرواتی ہے اور اس مقصد کے لیے ان کی تنخواہوں میں سے ایک معمولی سی رقم وضع کر لیتی ہے اور اسی جمع شدہ رقم میں سے کسی ملازم کی قبل از وقت موت کی صورت میں اس کے لواحقین کی امداد کرتی ہے، تو اس میں کیا مضائقہ ہے؟

ابوزہرہ جیسے نامی گرامی عالم، جنہوں نے فقہ اور شریعت میں تخصص حاصل کیا ہے اور وہ متجدد نہیں ہیں بلکہ راسخ العقیدہ علماء کے نمائندے ہیں، انہوں نے انشورنس کمپنی کے ساتھ کسی معاہدے کی مخالفت کی ہے کیونکہ کمپنی کاروبار میں دھوکہ دے سکتی ہے لیکن انہوں نے حکومت کے ساتھ انشورنس کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ اس میں دھوکے کا کوئی شائبہ نہیں رہتا۔ (عقد التامین: ص ۵۶)۔ اُن کے نزدیک یہ اجتماعی تعاون کی شکل ہے اور اس میں محنت کش یا دوسرے سرکاری ملازمین شامل ہوتے ہیں۔ ابوزہرہ کی طرح استاذ شیخ عبدالمنعم نمرہ نے بھی بیمہ کمپنیوں کے ساتھ معاملے کو ناجائز اور حکومت کے ساتھ جائز قرار دیا ہے۔

(مقالات امینی، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۷۰ء، ص ۱۷۹)

مئی ۱۹۶۵ء میں قاہرہ میں مجمع بحوث الاسلام کی دوسری مؤتمر منعقد ہوئی۔ اس کے سربراہ اتفاق سے شیخ ابوزہرہ ہی تھے۔ اس مؤتمر میں کافی غور وخوض کے بعد ارکان کی اکثریت نے اس پر اتفاق رائے کیا کہ جو بیمے اجتماعی تعاون کی بنیاد پر قائم ہوں اور لوگ اس میں شریک ہوں کہ ضرورت کے وقت ان کی مدد کی جائے گی تو وہ بیمے جائز ہیں کیونکہ ان میں تعاون علی البر کی صورت پائی جاتی ہے (التامین: ص ۱۲۲ مرتبہ سید محمد دسوقی)

اس کے جواز کے بعد مؤتمر کے ایک اہم رکن استاذ علی خفیف نے تعاونی بیمے کے علاوہ تجارتی بیمے کو بھی جائز قرار دیا۔ اپنے مؤقف میں ان کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ بیمہ ایک نیا عقد ہے جس کا نہ کسی نص صریح میں ذکر ہے اور نہ اس کی ممانعت ہے

لہٰذا اس صورت میں جواز و اباحت کا پہلو نکلتا ہے۔

۲۔ بیمہ ایک ایسا عقد ہے جس میں بہت سے مصالح ہیں اور نقصان کوئی بھی نہیں ہے۔ (یعنی اس میں رقم ڈوبنے کا کوئی احتمال نہیں ہے۔ بیمہ کمپنیاں قومیائے جانے کے بعد یہ احتمال بھی ختم ہو گیا ہے)۔

۳۔ بیمہ عرف عام بن گیا ہے جس سے عمومی و شخصی مصلحتیں وابستہ ہیں اور عرف خود اس کے جواز کی دلیل ہے۔

۴۔ موجودہ زمانے کی حاجت اور ضرورت بیمہ کے جواز کی مقتضی ہے۔

۵۔ بیمہ میں وعدہ سے زیادہ التزام پایا جاتا ہے۔ مالکی فقہ میں جس کا چلن سوڈان لیبیا، تیونس، الجزائر، مراکش، ماریطانیہ، نائجیریا، سینی گال، گیبون، نائجیریا، اپر وولٹا، چاڈ اور گنی جیسے بہت سے افریقی ممالک میں ہے، وعدہ پورا کرنا لازم ہے۔ بیمہ میں تو وعدہ سے زیادہ التزام پایا جاتا ہے۔ فقہ حنفی میں اگر بیع الوفا جائز ہے، جو محض وعدے کی بنیاد پر کی جاتی ہے، تو التزام کی صورت میں اس کے جواز کی ایک مضبوط دلیل مل جاتی ہے)۔

یہ تمام دلائل پیش کرنے کے بعد استاد علی خفیف اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بیمہ موجودہ دور کی ایک ضرورت ہے جس سے تجاہل ناممکن ہے۔ ان کے نزدیک بیمہ شرعاً جائز ہے۔

عالم اسلام کے نامور عالم دین استاذ احمد طہٰ سنوسی نے مسئولیاتی بیمہ (LIABILITY INSURANCE) کو عقد موالاۃ پر قیاس کرتے ہوئے جائز قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک اس میں کوئی قباحت نہیں اور یہ قانوناً صحیح اور شرعاً جائز ہے۔

(عقد التامین فی التشریع الاسلامی مجلہ الازہر۔ ج ۲۵)

موجودہ صدی کے آغاز میں مصر کے مفتی اعظم محمد عبدہٗ نے، جو بڑے روشن دماغ عالم سمجھے جاتے ہیں، بیمہ کے جواز کا فتویٰ صادر کیا تھا گو اس وقت کے علماء نے جو قدیم علوم کے ماہر تھے اور نئے مسائل سے واقف نہ تھے، مفتی صاحب کی مخالفت کی۔ مفتی صاحب نے اپنے فتوے کے حق میں جو دلائل دیے ان میں سے ایک محکم دلیل یہ بھی تھی کہ حکومت عوام کی نگران اور مالی کفالت کی ذمہ دار ہے۔ اس لیے حکومت کے ساتھ بیمے کا معاملہ

درست ہے۔ بیمہ کمپنی نگرانی اور کفالت کی ذمہ دار نہیں ہوتی اس لیے اس کے ساتھ ایسا معاملہ کرنا درست نہیں ہے۔ مفتی محمد عبدہٗ فرماتے ہیں کہ حکومت کی مثال خاندان کے ایک سربراہ کی سی ہے جو اپنے اہل خانہ سے رقم لے کر جمع کرتا رہتا ہے اور بوقت ضرورت ان پر خرچ کر دیتا ہے۔ مفتی صاحب کے نزدیک سرکاری خزانے پر ہر شخص کا حق ہے اس لیے اگر کسی نے اس میں سے کچھ لیا تو گویا اس نے اپنا حق وصول کیا کیونکہ حکومت تمام افراد کے حقوق کی محافظ و ذمہ دار ہے۔ (الاسلام والاشتراکیہ: ص ۲۰۹)

مصر کے مشہور فقیہ ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ (۱۹۶۳ء - ۱۸۹۹ء) نے بیمہ زندگی کو باہمی تعاون کی ایک شکل قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک اگر بیمہ کمپنی سودی کاروبار نہ کرے اور بیمہ دار کو ادا کی ہوئی رقم سے زائد واپس نہ کرے۔ تو ایسا معاملہ کرنا جائز ہے۔

(الاسلام والحیاۃ، ص ۲۱۶)

موسیٰ جار اللہ روس کے بڑے نامور عالم دین تھے جو روسی قیادت سے خفا ہو کر دوسری عالمی جنگ کے آغاز میں برطانوی ہند چلے آئے تھے۔ وہ اتنے بڑے عالم تھے کہ وہ ہمارے ہاں کے کسی عالم کو عالم ہی نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے ۱۹۴۳ء میں بیمہ کے موضوع پر ایک رسالہ قلمبند کیا۔ موصوف فرماتے ہیں کہ بیمہ کرانا اور بیمہ کمپنی قائم کرنا امر حسن اور نافع ہے اور کسی امانت دار اور خیر خواہ فقیہ کو اس میں شک نہ کرنا چاہیے۔

(رسالہ فی تامین الحیاۃ و تامین الاموال)

موسیٰ جار اللہ کے خیال میں بیمہ میں "النصیحۃ" یعنی خیر خواہی پائی جاتی ہے اور اسی طرح اس میں "الرعایۃ" یعنی حقوق کی نگہبانی کا پہلو نکلتا ہے۔ اس میں "الکفالۃ" بھی پائی جاتی ہے جس کے معنیٰ ذمہ داری کے ہیں۔ بیمہ میں چونکہ معاشرتی کفالت پائی جاتی ہے اور اسلام میں اس پر بڑا زور دیا گیا ہے اس لیے موسیٰ جار اللہ کے نزدیک بیمہ کے جواز میں کوئی کلام نہیں ہے۔

موسیٰ جار اللہ فرماتے ہیں کہ بیمہ کمپنی میں شرکت اختیاری ہے اور کمپنی حادثے کے وقت مشترکہ مجموعی رقم سے جو نقصان کی تلافی کرتی ہے وہ تعاون و تکافل کی صورت

ہے یعنی جس رقم سے نقصان کی تلافی کی جاتی ہے وہ امدادی ہوتی ہے، ادا کی ہوئی قسطوں سے کمائے ہوئے نفع کی رقم نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک شخص دو ہزار روپے پر زندگی کا بیمہ کراتا ہے اور یہ شرط رکھتا ہے کہ وہ ہر ماہ پانچ روپے بطور قسط ادا کرتا رہے گا لیکن ایک ہی قسط ادا کرنے کے بعد وہ مر جاتا ہے تو اس صورت میں کمپنی اس کے ورثا کو دو ہزار روپے ادا کرنے کی ذمہ دار ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دو ہزار کی رقم ایک قسط یعنی پانچ روپے کا نفع قرار نہیں پا سکتی۔ موسیٰ جار اللہ لکھتے ہیں کہ کمپنی اقساط کی رقم کو نفع بخش کام اور تجارت میں لگاتی ہے یہ مضاربت کی صورت ہے لہٰذا اس سے حاصل کیا ہوا نفع مضاربت کا نفع ہے، سود نہیں ہے جس کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن حکیم میں حرام قرار دیا ہے۔ (رسالہ فی تامین الحیاۃ و تامین الاموال)۔

مصر میں ۱۹۵۵ء میں بیمہ پر گفتگو کرنے کے لیے ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں ممتاز علماء نے شرکت کی تھی۔ اس کانفرنس میں جن علماء نے بیمے کے جواز کے حق میں مقالے پیش کیے ان کے خیال میں بیمہ کی غرض و غایت آمدنی کے ایک حصے کو محفوظ کرنا ہے تاکہ وہ ضرورت کے وقت کام آسکے۔ یہ آمدنی کے پس انداز کرنے کا ایک اختیاری معاملہ ہے جس سے نہ زندگی کی ضمانت حاصل ہوتی ہے اور نہ تقدیر سے مقابلے کا دھوکہ ہوتا ہے۔ یہ بیمہ زندہ رہنے کے لیے نہیں بلکہ مرنے کی صورت میں نقصان کی تلافی کے لیے کیا جاتا ہے۔ ان علماء کے خیال میں بیمہ ایک جدید معاملہ ہے جس کا قرآن و سنت میں صراحۃً ذکر نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے حل کے لیے لازمی طور پر اجتہاد کی ضرورت ہوگی۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔

۱۔ بیمہ کے نظام کو شریعت کے عمومی قواعد پر منطبق کر کے ایسی نظیر پر قیاس کیا جائے جو نص صریح سے ثابت ہو۔

۲۔ بیمہ کے مصالح و مفاسد پر غور کر کے ان طریقوں سے فائدہ اٹھایا جائے جو غیر منصوص احکام میں اجتہاد کے لیے مقرر ہیں۔

۱۹۴۹ء میں ملائشیا میں بیمے کے موضوع پر ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس میں ایرانی نمائندے نے، جو اثنا عشری مکتب فکر کی نمائندگی کر رہے تھے، کہا کہ بیمہ ایک ایسا

اقتصادی عمل ہے جس کی اسلامی تعلیمات میں گنجائش نکلتی ہے راقم الحروف نے کئی اثنا عشری عالموں سے اس مسئلے پر گفتگو کی ہے انہوں نے بیمہ کی موافقت میں دلائل دے کر کہا ہے کہ جس عمل سے عوام کا بھلا ہوتا ہو، ان کے ہاں اس کے جواز کا فتویٰ ہے۔ انہوں نے بھی کمپنی کی بجائے حکومت کے ساتھ معاملے کو مستحسن قرار دیا ہے۔

ملائشیا کی کانفرنس میں سوڈانی نمائندے نے امداد باہمی کے بیمے کو جائز قرار دیا تھا۔ گروپ لائف انشورنس امداد باہمی ہی کا دوسرا نام ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ سعودی عرب جیسے رجعت پسند ملک کے نمائندے نے بھی یہ تسلیم کیا کہ اگر بیمے کا مقصد امداد دینا ہو تو جائز ہے اور اگر نفع کمانا ہو، تو ناجائز ہے۔ (مقالات امینی: ص ۲۰۲) اسی کانفرنس کے دوران ایک ذیلی کمیٹی قائم کی گئی جس نے اپنی سفارشات میں کہا کہ موجودہ دور میں بیمہ کی اہمیت کے پیش نظر اگر امدادِ باہمی کی بنیاد پر بیمہ کیا جائے تو حلال ہے۔ ایسا معاملہ چند افراد مل کر بھی کر سکتے ہیں اور حکومت امداد باہمی کی بنیاد پر بھی ایسا کر سکتی ہے۔ (ماہنامہ البلاغ بمبئی، دسمبر ۱۹۶۹ء) کمیٹی نے اس بات کی بھی سفارش کی کہ مسلم ممالک کے درمیان بیمہ کے کاروبار کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ کمیٹی نے یہ تاریخی سفارش بھی کی کہ بین الاقوامی تجارت اور ادائیگیوں کے پیش نظر بین الاقوامی بیمہ کی موجودہ شکل کو مباح سمجھا جا سکتا ہے۔ کمیٹی نے اپنی سفارشات پیش کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ یہ سفارشات ہیں، انہیں فتوے کی اہمیت حاصل نہیں ہے۔

گذشتہ سال ۸ تا ۱۱ دسمبر دہلی میں بیمہ کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد ہوا جس میں نامور راسخ العقیدہ علماء نے شرکت کی۔ اس سیمینار کی صدارت امارت شرعیہ بہار کے قاضی، مولانا مجاہدالاسلام نے کی۔ راقم الحروف ان سے ذاتی طور پر متعارف ہے اور ایک بار پھلواری شریف میں انہیں مقدمات سنتے اور فیصلے سناتے ہوئے بھی دیکھ چکا ہے۔ ان کی علمی و عملی قوت، فقہی و دینی بصیرت اور تنظیمی صلاحیت کا اعتراف مدیر ماہنامہ معارف اعظم گڑھ مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے بھی کیا ہے۔ اس سیمینار میں یہ بات زیر غور آئی کہ بھارت میں آئے دن مسلم کش فسادات میں مسلمانوں کی جان و مال کو بھاری نقصان پہنچ

رہا ہے اس کے پیش نظر مسلمانوں کو اپنی جانوں اور املاک کا بیمہ کرانا چاہیے۔ مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ نے، جو عالم اسلام کے نامور عالم اور راسخ العقیدہ مسلمان مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی نگرانی میں کام کر رہی ہے، دہلی میں منعقد سیمنار سے پہلے بھارتی مسلمانوں کو بیمہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ دہلی کے سیمنار میں مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ کے فیصلے کی توثیق کی گئی۔

کیا پاکستان میں کوئی جرأتمند مفتی یہ فتویٰ صادر کر سکتا ہے کہ کراچی اور حیدرآباد میں آئے دن فسادات میں جو جانی و مالی نقصان ہو رہا ہے اس کے پیش نظر ان شہروں میں بسنے والوں کو اپنی جانوں اور املاک کا بیمہ کرانا چاہیے۔

راقم الحروف نے اب تک جن محققین کی آراء پیش کی ہیں، ان سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ گروپ لائف انشورنس ناجائز نہیں بلکہ احسن اور مرغوب ہے۔ اس سے محنت کشوں کو فائدہ ہی پہنچتا ہے ان کا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔

واللہ اعلم بالصواب۔